جناب نجم الثاقب

اُم الکتاب

سورۂ فاتحہ نماز کا جزوِ اعظم ہے۔ حدیثِ قدسی میں اسے "الصلوٰۃ" کہا گیا ہے۔ "کافیہ" اور "شافیہ" بھی اس کے نام ہیں۔ قرآن مجید اُسے "سبعہ مثانی" قرار دیتا ہے۔ (یعنی بار بار دہرائی جانے والی سات آیات)۔ اس میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورہ مبارکہ کا جزو ہے کہ نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ اس کا جزو نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ اس کا جزو ہے۔ بسم اللہ قرآن کریم کی مستقل آیت ہے۔ اللہ کے نام سے کام کی ابتدا حضرت نوحؑ کے زمانے سے ہوئی۔ صحیح کام پر ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق طلب کی جاتی ہے۔ اگر غلط کام ہوگا تو یہ اس کی تنبیہ بن جائے گی۔ حضرت سلیمانؑ کا خط ملکۂ سبا کے نام بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ (بجز سورۂ توبہ کے) بسم اللہ ہی سے شروع ہوتی ہے، جس سے تسمیہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اب سورۂ فاتحہ کے لفظی ترجمہ پر بھی ایک نظر ڈال لیں ــــ "اللہ (تعالیٰ) کے نام سے شروع جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بے حد مہربان، نہایت رحم والا مالک روزِ جزا کا، تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی۔

سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات حمد و ثنا پر مشتمل ہیں (جملہ واحد خبریہ)، باقی آیات خبر ہیں۔ اس میں تخاطب براہِ راست نہیں بلکہ غیب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ چوتھی آیت میں (جو مرکزی مضمون ہے) تخاطب کا مضمون ہے۔ یہاں کہنے والا رُو برو ہو گیا ہے، کیوں کہ میثاق کیا جا رہا ہے۔ مضارع کا صیغہ ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو شامل ہے۔ پانچویں آیت

سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق مانگی جا رہی ہے۔ آخری تین آیات کا بھی ایک جملہ بن رہا ہے۔ حدیث قدسی میں (جو حدیث اور قرآن کے بین بین ہوتی ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، نصف اس کے لیے ہے اور نصف میرے لیے ہے۔" سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ایک دوسری حدیث قدسی کے مطابق جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ "میرے بندے نے میری حمد کی"۔ جب بندہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے تو ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ "میرے بندے نے میری تمجید کی"۔ جب بندہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کے الفاظ پر آتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے ھذا بینی و بین عبدی یہ میرے اور بندے کے مابین ہے۔ آخری آیات پر ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ حصہ میرے بندے کے لیے ہے۔ جو کچھ اس نے مانگا، میں نے اسے عطا کیا"۔ اگر کوئی شخص طلب کی گہرائی سے یہ دعا کرے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ پہلی تین آیات حمد، صلوٰۃ اور تمجید پر مشتمل ہیں۔ ان میں توحیدِ کامل کی تلقین کی گئی ہے۔ حمد، تعریف کو کہتے ہیں مگر مجرد تعریف سے شکر کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس میں حمد اور شکر دونوں کا مفہوم آجاتا ہے، جہاں شکر کا کلمہ آتا ہے وہاں حمد کا لفظ بھی آتا ہے۔ صبح کو آنکھ کھلی تو لبوں پر ترانۂ شکر آگیا کہ خدا نے زندگی کا ایک اور دن عطا فرمایا۔ زندگی اس کا عطیہ ہے اس پر بھی کلمۂ شکر ادا ہونا چاہیے۔ صحیفۂ ماثورہ میں جہاں شکر کا لفظ آئے گا، وہاں کلمۂ حمد بھی ضرور آئے گا۔ اَلحمدُ للہ ایک مثبت کلمہ ہے۔ شکر کا جذبہ اسی کے لیے ہے جس نے ہمیں خلعتِ وجود عطا کیا۔ یہ جذبہ شعور کی ترقی کے ساتھ ارتقا حاصل کرتا ہے۔

ابتدائی جذبۂ تشکر والدین کی طرف منعطف ہو جاتا ہے کیوں کہ وہی ہماری کفالت کرتے ہیں۔ جوں جوں ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے، حکمت کی بلند ترین منزل سامنے آتی جاتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اسباب کا سارا سلسلہ تو ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے، اسی لیے ہمارا جذبۂ شکر اسی ذات پر مرتکز ہو جاتا ہے اور یہی

بلند ترین معرفتِ خداوندی ہے۔ وہ قادرِ مطلق حکیمِ کُل ہے۔ اسی کی ذات مظہرِ کمال و جمال ہے، وہی حمد کے لائق ہے۔ الحمد للہ رب العلمین۔ لفظِ اللہ کلمۂ جامد ہے مشتق نہیں۔ خدا کا نام ذاتی ہے اور وہ اللہ ہے، آلِہٰ پر الف، لام داخل ہوا تو اللہ بن جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ مشتق ہوگا۔ رحمٰن اور رحیم صفاتی نام ہیں۔ ان سے پہلے الف لام آ جائے تو خصوصیت پیدا ہوگی۔

مشرکینِ عرب میں شرک فی الخلق موجود نہ تھا، اُلوہیت اور ربوبیت اسی خالق کے لیے ہے اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ چنانچہ میدانِ بدر میں جب قریش کا لشکر پہنچا تو ابوجہل نے جو دعا کی وہ اللّٰھُمَّ سے شروع ہوتی ہے۔ عربی میں صفت و موصوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ رب العلمین (عالمِ خلق و امر) رب۔ پالنے والا پروردگار۔ وہ ہستی جو کسی چیز کو تدریجاً ترقی دیتے ہوئے اسے درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ یہ ربوبیت ہے۔ ربوبیت کا تصور بنیادی ہے، اگرچہ خلق مقدم ہے ربوبیت پر۔ انسانی ذہن پر سب سے پہلا تاثر ربوبیت کا پڑتا ہے۔ خلق کا تصور بعد میں آئے گا۔ اس لیے قرآن کریم نے رب تعالیٰ کی حیثیت کو مقدم رکھا ہے۔ صفات بعد میں آئی ہیں۔ رحمٰن رحیم۔ رحمٰن الدنیا، رحیم الآخرۃ، اس کی رحمت کی دو شانیں بیان ہوئی ہیں۔ رحمٰن فعلان کی صفت پر، کوئی چشمہ ابل رہا ہو۔ دریا جو روانی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ رحیم، فعیل کے وزن پر، جوش مارتی ہوئی رحمت جس میں دوام ہو، تسلسل ہو۔ تخلیقِ کائنات اس کی شانِ رحمانی کی مظہر ہے اور اس کی شانِ رحیمی اس کی ربوبیت کی آئینہ دار ہے، اس کی رحمت کا دسترخوان بہت وسیع ہے۔ وہ کفار کو بھی دے رہا ہے۔ مالک یوم الدین۔ جو اختیارِ مطلق رکھتا ہو۔ دین کے لفظ کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے اصلی معنی جزا و سزا کے ہیں۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس میں اطاعت اور قانون کا مفہوم بھی جمع ہو گیا۔ ایک ہستی جو مطاع ہو۔ اس کا قاعدہ اور قانون ہو۔ اس کی جزا کی توقع رکھو اور سزا سے بچتے رہو۔ یہ

ے اس کے دین میں رہنا - دین اللہ - سورۂ یوسف میں دین الملک کے الفاظ ان ہی معنوں میں ہیں - ایاک نعبد و ایاک نستعین (سورۂ فاتحہ کی مرکزی آیت ہے - پہلے صیغۂ غائب میں گفتگو ہو رہی تھی - اب مخاطب کا صیغہ آگیا ہے یعنی اللہ کے حضور میں حاضری ہو گئی - جاتا ہے - ایاک نعبد و ایاک نستعین ، یہاں کے ضمیر مفعولی ہے - "ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے" تمام دوسری بندگیوں کی نفی ہو گئی - اگر مفعول کو مقدم کر دیا جائے تو حصر کے معنی پیدا ہوں گے - اس آیت میں پھر لفظ عبادت آگیا - عبد کا اصلی مفہوم التذلل ہے کسی کے سامنے جھک جانا یا بچھ جانا ہے - اس کا جزوِ اعظم اطاعت ہے - اصل تذلل وہ ہوگا جب انسان کسی کا تابع فرمان ہو جائے - یہ ہے عبادت کی اصل یعنی اطاعتِ کل - مگر ہم صوم و صلوٰۃ کی پابندی کو ہی عبادت سمجھتے ہیں - یہ تصور مسخ شدہ ہے ، اطاعتِ خداوندی زندگی کے تمام گوشوں میں ہونی چاہیے - عبادت وہی ہے جو جبر و اکراہ کے تحت نہ ہو - بلکہ [illegible] کا جذبہ ہونا چاہیے - خدا کے ساتھ والہانہ محبت ہو - یہ لفظ عشق سے زیادہ [illegible] رکھتا ہے -

یہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ممتاز ہے - قرآن کی اصل دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو - تمام انبیا کی دعوت یہی رہی ہے - ایاک نعبد کے فوراً بعد و ایاک نستعین کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہماری ہدایت کا دارومدار تیری توفیق پر ہے - اهدنا الصراط المستقیم ، ہدایت دے ہمیں سیدھے راستے کی جس پر تیرے وہ بندے چلے جن پر تو نے انعام کیا اور وہ چار گروہوں پر مشتمل ہیں ، انبیائے کرام ، صدیقین ، شہدا اور صالحین - جیسا کہ قرآن مجید سے ظاہر ہے - پھر ہدایت کے درجے ہیں - پہلے ہدایت واضح ہو ، اس کے لیے دل کھل جائے - پھر تو ہمیں سیدھی راہ پر چلا اور منزل پر بھی پہنچا دے - زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر قدم پر ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے - یہ خیال غلط ہے کہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم کی کیا ضرورت ہے ، وہ تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں - ہدایت کے لیے علمی روشنی کافی نہیں ، اس کے لیے انشراحِ صدر کی ضرورت ہے -

اس سے یہ ضمنی طور پر تلقین ہو گئی کہ اصل نعمت ہدایت ہی ہے۔ اس کے بغیر باقی تمام چیزیں موجبِ عذاب بن جائیں گی۔ صحت بڑی نعمت ہے۔ اگر ہدایت نہیں تو جسمانی توانائیاں کس کام کی۔ ہر سانس ایک نعمت ہے اگر ہدایت کی دولت مل گئی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے یہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ہر سانس جو جسم میں جاتا ہے موجبِ تقویت ہوتا ہے اور جب باہر آتا ہے تو فرحتِ ذات کا باعث بنتا ہے۔ پس ہر سانس پر دو شکر واجب ہیں۔ خدا تعالیٰ سے جب بھی مانگنے کا موقعہ ملے تو صرف ہدایت مانگی جائے۔ یہ اوّلین تلقین ہے جو ہمیں دی گئی۔ صراط المستقیم مرکب توصیفی ہے۔ انسانی زندگی کا معتدل راستہ جو افراط و تفریط سے بچا ہوا ہو۔ اس دنیا میں بھی سکون حاصل ہو اور آخرت میں بھی ابدی راحت حاصل ہو۔ جہاں تک معرفتِ رب تعالیٰ کا تعلق ہے یہ فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اگر عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ موجود ہو تو جزا و سزا تک عقلِ انسانی کی رسائی ہوتی ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت دو روشن حقیقتیں ہیں۔ ہمارے اندر نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ ربوبیتِ خداوندی کا ہم عہد کر آئے ہیں مگر انسان اس کے لیے محتاج ہے کہ اس کی شریعت کا ہمیں تفصیلی علم ہو جائے ورنہ عقل ٹھوکر کھائے گی اور یہ رسالت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے ایمان بالرسالت کی ضرورت ہو گی۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ مغضوب علیہ سے مراد یہود ہیں اور نصاریٰ کے گروہ کو ضالین کہا گیا ہے یعنی گم کردہ راہ۔ لفظ ضال مغضوب علیہ سے کم تر ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ میں اچھے لوگ بھی تھے مگر دوسروں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر کج روی اختیار کی۔

پوری سورۃ کا نقطۂ عروج یہی ہدایت کی استدعا ہے جو فلسفۂ دین کی کامل اساس ہے۔ پہلے جملے میں حمد و ثنا و تمجید ہے مگر براہِ راست تخاطب نہیں، جیسے کوئی غیب میں رہتے ہوئے حمد کر رہا ہو۔ درمیانی جملہ اظہارِ حال اور قول و قرار پر مشتمل ہے جس میں عبد و معبود دونوں جڑ جاتے ہیں۔ اس سے آگے ہدایت کی دعا ہے اور استعانت دعا کی قائم مقام ہے۔ اگر یہ دل کی گہرائیوں سے نکلے تو ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور خدا کی طرف سے اس کی قبولیت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔